

## نابر کہانی: فکشن اور تاریخ کا اہم مطالعہ

پاکستان کی سرزمین ثقافتی ورثے کے اعتبار سے دُنیا کی قدیم ترین اور نہایت توانا تہذیب ہے اور پاکستانی قوم اپنی تہذیب و ثقافت کے بارے میں جتنی لاعلم اور بے نیاز ہے اس کی مثال بھی شاید دُنیا میں کہیں نہ ملتی ہو۔ ان دونوں پہلوؤں کی تشریح و توضیح ایک الگ موضوع ہے۔ پاکستانیوں کی بے نیازی اور لاعلمی کے سینکڑوں پہلو ہیں، جن میں سب سے افسوسناک رویہ یہ ہے کہ جو ثقافتی ورثہ تحریری صورت میں لایا جاسکتا تھا اُس پر بھی بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ ہمارے ہمہ جہت ثقافتی ورثے کا ایک پہلو داستان گو فنکاروں کی بیان کردہ کہانیاں ہیں جو ہمارے تحریری ادب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ڈاکٹر سعید خاور بھٹا صاحب انتہائی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ گزشتہ پچیس برس سے اس اہم کام پر محنت کر رہے ہیں۔ کوئی دس برس پہلے اُن کی مرتبہ کتاب ”کمال کہانی“ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس میں ایک کتھی (داستان گو) کمال دین سے سنی ہوئی کہانیاں کتھی کے اپنے لہجے اور اسلوب سے جمع کر دی گئی تھیں۔ تب تک میں اس کتاب کو سارے پاکستانی ادب کی اہم ترین کتاب شمار کرتا تھا۔

سعید بھٹا صاحب کی نئی کتاب ”نابر کہانی“ اس سلسلے کی نئی کتاب ہے جو اُن کی سابقہ ”کمال کہانی“ سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کی مزید اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ”کمال کہانی“ میں کہانیوں کا صرف متن تھا جو داستان گو سے ریکارڈ کر کے ورطہ تحریر میں لایا گیا تھا جبکہ موجودہ کتاب میں چھ کہانیوں کے علاوہ ان کہانیوں کا تاریخی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ”نابر کہانی“ ایسی چھ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ہماری تاریخ کے اہم واقعات بھی شمار ہوتے ہیں۔ تین کہانیاں احمد خان کھرل کے بارے میں جبکہ باقی تین کہانیوں کا تعلق راجا پورس، مراد خٹیا نہ اور جلدے خان کھرل کے بارے میں ہیں۔

ان کہانیوں کا تاریخی جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے 75 سے زائد کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور بیان کردہ ہر تاریخی واقعے کا حوالہ دیا ہے۔ ان کتابوں میں خاص بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں شاید پہلی مرتبہ فارسی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

سکندر اور راجا پورس کے بارے میں اس سے پہلے جو معلومات ہمارے ہاں ملتی ہیں وہ انگریزی کتابوں سے آئی ہیں۔ ان انگریزی کتابوں میں زیادہ تر یونانی، لاطینی اور حبشی حوالے ملتے ہیں جبکہ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

اس تاریخی واقعے کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کے بارے میں تاریخ دانوں کا سارا زور سکندر کی شخصیت اور فتوحات پر صرف کیا گیا ہے جبکہ پورس کا ذکر محض برائے بیت آتا ہے۔ ہماری نصابی کتب میں بھی سکندر اور پورس کو کچھ اس انداز میں لکھا گیا ہے جیسے سکندر کوئی مسلمان فاتح تھا جس نے ایک ہندو راجا کو شکست دی۔

برصغیر کی تاریخ میں ایک انتہائی احمقانہ مغالطہ عرصہ دراز سے چلتا آ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندو مذہب برصغیر کا قدیم ترین مذہب ہے۔ ہم پاکستانی تو یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے جو کچھ بھی تھا وہ ہندو ازم تھا۔ راجا پورس کو کئی کتابوں میں ہندو راجا ہی کہا گیا ہے۔ میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مغالطے پر مختصراً کچھ عرض کروں۔

ہندو ازم کے بارے میں ایک بات تو طے شدہ ہے کہ اس کا سرسری آغاز رام چندر جی اور سیتا سے ہوتا ہے۔ ہم میں سے اکثر نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ رام چندر جی کا تعلق تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے زمانے سے ہے، یہ واقعہ والمکی نے اپنی کتاب رامائن میں بیان کیا ہے اور یہ اُس کے اپنے عہد کا واقعہ ہے۔ بلکہ یہ کہہ لیں کہ وہ اس سارے واقعے کا خود ایک کردار ہے۔ والمکی ایک درویش بھی تھی اور اس نے بے سہارا لوگوں کے لیے آشرم بھی کھول رکھا تھا۔ رامائن میں لکھا ہے کہ جب رام نے اغوا شدہ سیتا کو بازیاب کرنے کے بعد تاج و تخت سنبھالا تو عوام کو شبہ تھا کہ سیتا بے داغ نہیں تھی، لہذا عوام کے اصرار پر رام نے سیتا کو نکال دیا اور وہ والمکی کے آشرم میں پہنچی۔ اس وقت وہ حاملہ تھی۔ گویا اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ رام اور سیتا کا واقعہ والمکی کے اپنے دور کا واقعہ ہے اور وہ اس واقعہ کی صرف داستان گو نہیں بلکہ چشم دید مورخ ہے۔ میں یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ جن چار ویدوں کو ہندو ازم کی بنیاد سمجھا جاتا ہے وہ رامائن کے دور سے بہت پہلے کے ہیں۔ ان ویدوں میں جو مذہبی تصورات ملتے ہیں اُن کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا ہندو ازم سے کوئی تعلق نہیں۔ چار ویدوں کے بعد اُن لکھے گئے، اس کے بعد مہابھارت مرتب ہوئی اور اس کے بعد رامائن لکھی گئی۔ رامائن کے بعد منوسمرتی کا دھرم شاستر لکھا گیا جو ہندو عقائد کی اصل بنیاد ہے۔ رامائن اور دھرم شاستر کا

زمانہ بعد از مسیح ہے۔ اس سب کچھ سے بہت پہلے قریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح وادی سندھ کی عظیم تہذیب کے عروج کا زمانہ ہے جس سے ہمیں کچھ مجسمے تو ملتے ہیں لیکن بُت نہیں ملتے۔ اسی طرح بدھ مت اور جین مت دونوں کا تعلق بھی قبل مسیح ہے۔ جین مت کے بارے میں بھی ہم عموماً یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس کے بانی مہاویر تھے جو 540 ق۔م میں پیدا ہوئے حالانکہ جین مت کے عقائد کے مطابق مہاویر اُن کے 24 ویں اور آخری پیغمبر تھے۔ جین مت والے اپنے پہلے پیغمبر کا زمانہ کئی کروڑ سال پہلے بتاتے ہیں۔ یہ ضمنی بات ذرا طویل ہوگئی۔ اصل بات ہو رہی تھی کہ عظیم پورس کے بارے میں ہماری تحریریں بہت تشنہ ہیں کیونکہ ہم نے اپنی تاریخ کے بارے میں خود کوئی جستجو نہیں کی بلکہ معلوم تاریخی واقعات پر بھی غور نہیں کیا جیسا کہ میں نے یہاں کے قدیم مذہب کی طرف توجہ دلائی ہے۔

میں یہاں منورخوں کی توجہ ایک اور تاریخی مغالطہ کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ آریاؤں، ویدوں اور ہندو ازم کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ دانوں کے ذہن میں ایک مفروضہ بنیاد بنا رہا ہے کہ برصغیر کی سب سے بڑی زبان سنسکرت تھی اور یہ کہ سنسکرت برصغیر کی تمام زبانوں کی ماں تھی۔ اس مفروضے کو اختیار کیے بغیر اُس وقت تک کوئی چارہ نہیں تھا جب تک وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں انسان لاعلم تھا۔ 1922ء میں یہاں کی کھدائی سے لے کر اب تک متعدد نئے حقائق سامنے آچکے ہیں جن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب بہت متمدن شہری تہذیب تھی جس میں ادب، فنون لطیفہ، کاشتکاری، صنعت و حرفت، ہر امن معاشرے کی تعمیر اور منصفانہ حکومت کے پہلو مثالی حیثیت رکھتے تھے جبکہ آریاؤں کی تہذیب جنگلی اور صحرائی تہذیب تھی۔ آریہ متمدن شہروں کے اسلوب زندگی سے ناواقف تھے۔ ان دونوں قوموں کے بارے میں متذکرہ حقائق کا تو سب ذکر کرتے ہیں لیکن یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ دنیا کی کوئی زبان ہوا میں ترقی نہیں کرتی۔ زبان کو ایک متمدن اور علوم و فنون کے ماہرین کا معاشرہ ہی ترقی یافتہ بناتا ہے۔ پھر اس پس منظر میں یہ کیسے فرض کر لیا جاتا ہے کہ آریاؤں کی زبان سنسکرت سب سے بڑی یا صرف بڑی زبان تھی؟ حالانکہ متمدن تہذیب کا سارا کام تو پراکرتوں (مقامی زبانوں) میں ہوا تھا۔ اس پس منظر میں برصغیر میں بولی جانے والی زبانوں کی تقسیم کا پہلے سے کیا ہوا سارا کام ہی غلط بنیادوں پر ہوا ہے۔ جب ان مفروضوں کو ہی بنیاد بنا کر برصغیر کی قدیم تاریخ و ثقافت کا جائزہ لیا جاتا رہے گا تو صحیح نتائج پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر سعید بھٹا صاحب نے کمال محنت سے تاریخ کے کچھ گم شدہ اوراق گرد صاف کر کے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ سکندر اور پورس کے علاوہ جائزے میں دیگر کہانیوں کا تاریخی تقابل بھی کیا گیا ہے، جن سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ داستان گو فنکاروں کی بیان کردہ یہ کہانیاں محض تخیلاتی نہیں بلکہ کہانیوں میں درج واقعات تاریخ سے ہی اخذ کیے گئے ہیں۔

اس موضوع پر مزید علم کے متلاشی اُن 75 کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کر سکتے ہیں جن کے ڈاکٹر صاحب نے حوالے دیے ہیں۔ تاہم یہ اصل کام کی صرف ابتدا ہے۔ ہمیں اپنی تاریخ کو نئے سرے سے دیکھنے کی از حد ضرورت ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس نے اس تحقیقی کتاب کو مزید اہم بنا دیا ہے۔

(ہفت روزہ ”ہم شری“ 23 تا 29 اپریل 2010ء)